شذرات

میرے شیخ علامہ عبید اللہ ابن اسلام سندھی کی ولادت ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) سیالکوٹ کے قریہ چیانوالی (پنجاب) میں ہوئی۔ آپ کا باپ سکھ تھا۔ آپ جب پڑھنے کے لائق ہوئے تو ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں علم کی طلب شروع ہوئی۔ ریاضی میں حساب، الجبرا، اقلیدس، تاریخ ہند میں مشغول ہوئے اور عام مدارس میں جو پڑھایا جاتا ہے اس سے زیادہ پڑھا اور آپ کو جو کتاب ملتی تھی اس کے مطالعہ کے لیے حریص تھے۔ اللہ پاک کی مدد سے آپ کو شیخ عبید اللہ کی کتاب تحفتہ الہند مل گئی۔ وہ ہندو تھے اور ۱۳۰۱ھ میں مسلمان ہوئے تھے اور اس کے مطالعے پر دوام کیا۔ یہاں تک کہ اس کو سمجھا پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسلام کی حقیقت اور ایمان کی آپ کو توفیق عطا ہوئی اور اپنے گھر سے مخفی ہو کر نکلے اور سندھ میں پہنچ کر اسلام کا اعلان کیا اور صاحب تحفہ کے نام پر اپنا نام عبید اللہ رکھا اور سید العارفین حافظ محمد صدیق سندھی (ف ۱۳۰۸ھ) کے پاس پہنچے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ۱۳۰۵ء میں حافظ صاحب نے آپ کو اذکار توحید کی تلقین فرمائی۔

سید العارفین حافظ صاحب کی خدمت میں ذکر اور فکر کی تلقین حاصل کی جس کے بعد علوم شرعیہ میں مشغول ہوئے اور اس کے مبادی حاصل کرنے کے لیے ملتان گئے اور ملتان کے شیوخ میں سے مبادی صرف و نحو کو حاصل کیا پھر ماہ صفر ۱۳۱۶ھ میں دار العلوم دیو بند چلے گئے، پھر منطق اور فلسفہ پڑھنے لگے اور اس کے لیے کانپور اور خیر آباد چلے گئے پھر منطق اور فلسفے کو مفتی لطف اللہ اور مولانا عبد الحق خیر آبادی (ف ۱۸۶۱ء) کے تلامذہ سے پڑھا اور ان علموں کے پڑھنے کے لیے چھ ماہ غائب رہے اور پھر دیو بند لوٹے۔ یہ صفر کا مہینہ تھا (۱۳۰۷ھ)۔

جب فلاسفہ کی کتابوں سے فراغت پائی تو اپنی نظر کو اصول فقہ کی طرف متوجہ کیا تو ان علوم کے مبادی کو دار العلوم کے شیوخ سے حاصل کیا جن میں شیخ ابو الطیب حافظ محمد احمد (ف ۱۹۲۹ء) ابن شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم دیو بندی (ف ۱۸۸۰ء) اور دوسرے علما تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی (ف ۱۹۲۰ء) سے فقہ میں ہدایہ اور مطول اور تفسیر بیضاوی پڑھی اور آپ سے شرح مواقف کی مشکلات میں رجوع فرمایا اور مسلم الثبوت میں اتفاق حاصل کیا۔

شعبان ۱۳۰۷ھ میں امتحان اور اختبار کے بعد دار العلوم دیو بند کے شیوخ آپ سے راضی ہوئے، ان میں سے شیخ سید احمد دہلوی (ف ۱۸۹۴ء) راضی ہوئے جنھوں نے درجہ انتہائیہ کی شاہدی دی۔ اس درجہ پر آپ سے پہلے دار العلوم دیو بند کی تاریخ میں کوئی ایک یا دو کامیاب ہوئے تھے۔ حضرت شیخ نے مواحد الوصول الی مقاصد پڑھنے کے اس آخری سال میں تصنیف فرمایا۔ اس میں مسلم الثبوت کو تلخیص فرمایا اور اس کی طرف تحریر ابن الھمام اور شرح مختصر العضد کا اضافہ فرمایا اور کچھ دوسری کتابیں بھی اضافہ فرمائیں۔ جب انھوں نے اپنی اس تصنیف کو اپنے شیخ شیخ الہند پر پیش فرمایا تو حضرت شیخ الہند نے اس کو مستحسن فرمایا اور اپنا لباس پہنایا اور اصول کی کتابوں سے فراغت کے بعد اور علم کلام سے فراغت کے بعد اپنے شیخ کے شیخ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہوئے۔

اور ۱۳۰۸ھ حدیث کے پڑھنے کے لیے اپنے آپ کو مجرد رکھا۔ پھر جامع ترمذی کو شیخ الہند پر پڑھا اور سنن امام ابی داؤد کو اپنے شیخ رشید احمد پر پڑھا اور اس سال کے آخر میں حضرت شیخ الہند سے ان کو عام اجازت مل گئی۔

شیخ نے اپنی اس تالیف میں کہا ہے کہ حضرت شیخ الہند کے وصایا میں سے میں نے جو یاد کیا اور حفظ کیا یہ ہے کہ اصحاب مصنفین سے نزاع نہ کیا جائے اور ان کی تصحیح کی مخالفت نہ کی جائے اور ان میں جو متاخر شک کرنے والے ہیں ان کی طرف التفات نہ کیا جائے اور جمع اور تطبیق کو ترجیح پر مقدم کیا جائے اور ہمت کو جمع کیا جائے۔ طبقۂ اولیٰ کے احادیث پر جو مؤطا اور صحیحین ہیں اور طبقۂ ثانیہ کی کتابوں پر جو سنن ترمذی اور نسائی ہیں۔ حفظ اور قرأت کے اخذ میں حاجت کے وقت مسند امام احمد پر اقتصار کیا جائے اور شروح میں فتح الباری پر اعتماد کیا جائے اور پھر حجۃ اللہ البالغہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

حضرت شیخ تین سال میں درس نظامی سے فارغ ہوئے۔ اس سے آپ کے کمال ذکاء اور حدت ذہن کا پتا پڑتا ہے اس کے بعد آپ نے شیخ طریقت کی زیارت کا ارادہ کیا اور وہ تھے سید العارفین حافظ محمد صدیق سندھی لیکن شیخ العارفین سید محمد صدیق صاحب قبل اس کے کہ مولانا عبید اللہ صاحب وہاں پہنچ سکیں دس دن پہلے فوت ہو چکے تھے۔ آپ کے بعض اصحاب مولانا ابو السراج غلام محمد دین پوری اور مولانا ابو الحسن تاج محمود امروٹی سندھی آپ کی ظاہری اور باطنی تربیت میں مشغول ہو گئے پھر شیخ نے سندھ کے ایک گاؤں امروٹ میں دس سال ۱۳۰۸ھ سے ۱۳۱۹ھ تک قیام فرمایا۔ وہاں دینی مدرسہ قائم کیا اور ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا جس میں نادر کتابیں جمع کی گئی پھر وہاں درس دیا اور تالیف و تصنیف کی اس مدت میں ایک بڑی مخلوق نے آپ سے استفادہ کیا۔ جن میں سے سب سے بڑا مولانا عبد الوہاب کلاچی سندھی تھا۔ اس نے توضیح و تلویح، ھدایہ اور دوسری بڑی کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبد الوہاب اللہ

پاک کی ایک رحمت تھی ذہن کی تیزی اور وسعت علم میں بڑے ماہر تھے۔اور وہ علوم میں بحر مواج تھے جس کا کوئی ساحل نہ تھا۔میں نے کئی علمی مسائل میں ان سے استفادہ کیا۔فللہ الحمد علی ذٰلک۔

سات سال کے بعد حضرت شیخ نے ۱۳۱۵ھ میں حضرت شیخ الہند کی طرف رجوع فرمایا اور اپنی بعض مؤلّفات کو حضرت شیخ پر پیش کیا اور حل اشکالات میں ان کی طرف رجوع کیا اور آپ پر بعض کتب حدیث کے اطراف کو پڑھا۔مسند امام احمد، معانی الآثار امام طحاوی، موطا امام مالک بروایت امام یحییٰ و بروایت امام محمد۔اس قرأت میں اور کوئی آپ کے ساتھ شریک نہ تھا، نہ کوئی قاری تھا اور نہ کوئی سامع۔

پھر سندھ کی طرف دوسری بار لوٹے اور توجیہ الافکار میں دارالعلوم کی طرح مشغول ہوئے اور یہ کام ۱۳۱۹ھ میں حیدرآباد سندھ کے گوٹھ پیر جھنڈا میں دارالرشاد میں وہاں کے محدث سید ابوتراب رشد اللہ صاحب العلم کی مشارکت سے مدرسہ قائم کیا اور پیر صاحب سے کتب تفسیر و حدیث اور دوسرے علوم کی کتب حاصل کیں۔اصل میں یہ کتب خانہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کے خاندان سے حاصل کیا تھا دارالعلوم میں آپ پر ایک بہت بڑی جماعت نے علوم کو کسب کیا۔ان میں سے محدث علامہ شیخ امید علی سندھی اور مفسر العصر مولانا احمد علی سندھی لاہوری، شیخ موحد قامع البدعت سید ضیاء الدین صاحب العلم، مفسر محقق شیخ عبداللہ لغاری سندھی، عامل بالحدیث شیخ محمد اکرم ہالائی، مولوی مفتی عبدالقادر سندھی وغیرھم تھے۔میں نے صاحبِ فضیلت مولانا سید وھب اللہ صاحب العلم سے سنا کہ ان کے دادا محدث ابوالتراب اگرچہ علم میں وحید تھے لیکن انھوں نے بھی علامہ عبید اللہ کے پاس منطق میں سلم العلوم کو پڑھا۔میں نے اپنے شیخ علامہ عبدالکریم کورائی سے سنا کہ انھوں بھی علامہ موصوف پر قرآن مقدس وغیرہ پڑھا۔

حضرت شیخ جب مکہ مکرمہ سے سندھ واپس ہوئے تو پیر جھنڈا میں سندھ کے بڑے علماء نے آپ سے پڑھا جیسا کہ مرحوم علی محمد کا کے پوتا، مولانا عبدالحق ربانی، عالم جلیل حافظ محمد خلیل نزیل سجاول سندھ اور یہ بندہ ضعیف غلام مصطفیٰ قاسمی اور میرے دوست مولوی نور محمد سجاولی اور قاضی عزیز اللہ وغیرھم۔حضرت شیخ کی پیر جھنڈا میں وہی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفہ پر درس کی مواظبت تھی۔جس طرح امروٹ سندھ میں مواظبت تھی۔

دارالرشاد پیر جھنڈا سے فارغ ہونے والے حضرت ابوتراب صاحب العلم کے زعامت کے ماتحت قادر ہوئے کہ حضرت شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ صاحب کو دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۲۷ھ میں امر فرمایا تو آپ نے شیخ کے حکم پر لبیک فرمایا اور آپ دارالعلوم میں پہنچ گئے اور وہاں جمعیۃ الانصار قائم کی اور وہاں

جمعیت کا بڑا کام تھا۔ تنظیم تکمیل الشرعیات اور یہ تکمیل دونوں طائفوں کے لیے تھا جو مکاتب دینیہ اور مکاتب عصریہ سے نکلے تھے اور ہلال احمر کے لیے نفقات کا جمع کرنا اس کی تفصیل موقتہ مجلات القاسم وغیرہ میں مطبوع ہے۔ اس کی طرف رجوع کریں۔

شیخ استاذان اعمال پر چار سال تک چلتے رہے اور جب حکومت برطانیہ نے ہندی شعبوں کو یہ حکم دیا کہ کلکتہ سے دہلی کی طرف نقل کریں تو سیاسی قوتیں اس جدید مرکز میں جمع ہو گئیں اور میرے شیخ علامہ نے دہلی میں اپنے شیخ حضرت شیخ الہند کے حکم سے نظارۃ المعارف القرآنیہ کی تاسیس فرمائی اور اس میں قرآن حکیم طریقہ اعتبار فوز الکبیر شاہ ولی اللہ دہلوی پر درس دینے لگے اور شاہ صاحب کی تصنیف حجتہ اللہ البالغہ سیاست حاضرہ کی حجت تامہ اور اطلاع تام پر پڑھانے لگے۔ اس جمعیتہ میں مسلمانوں کے اکابر اور زعماء شریک ہوئے جیسے نواب وقار الملک علی گڑھ کے، حکیم مسیح الملک محمد اجمل خان دہلی کے اور نوجوان علماء دین بھی شریک ہو گئے لیکن اسی اثناء میں جنگِ عمومی واقع ہوئی تو حضرت شیخ الہند نے میرے شیخ کو ۱۳۳۳ھ میں کابل کی طرف ہجرت کا حکم فرمایا، نظارۃ المعارف کا درس بند کیا گیا اور اسی طرح سندھ میں مدرسہ دارالرشاد کے بند کرنے کا حکم بھی حکومت نے کیا۔

میرے شیخ نے دہلی سے سندھ کی طرف سفر فرمایا۔ حکومت سے چھپ کر جانے کا حکم بڑا سخت تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو سہل فرمایا اور ۱۳۳۳ء میں سندھ سے کابل کی طرف سفر فرمایا۔ شیخ کابل میں سات برس ٹھہرے وہاں جمعیت سیاسیہ (انڈین نیشنل کانگریس) کی تاسیس فرمائی اور اس کو عسکری نظام (جنود ربانیہ) عطا کیا۔ اس سے افغانستان کو آزادی حاصل ہوئی۔ یہ سب آپ کے مساعی اور مبارک اعمال کا فضل تھا۔ اس کی بہت بڑی تفصیل ہے جو یہاں نہیں دی جا سکتی۔

جب دو متحارب انگریز اور افغانستان کے درمیان صلح ہوئی اور شیخ کے لیے کابل میں قیام مقصر ہو گیا تو پھر وہاں سے استانبول کی طرف ۱۳۴۰ھ میں جانے کا ارادہ کیا۔ آپ شرق اوسط کے مطالعہ پر بھی بہت حریص تھے۔ آپ پر شمال کے سوا طریق بند تھی تو آپ نے روسی اشتراکیہ کے وکیل سے بات کی۔ اس نے راستے کے آسان بنانے کا وعدہ کیا۔ جب وہ روس میں داخل ہوئے اور نہر جیحوں کو عبور کر لیا۔ شیخ جب روس میں داخل ہوئے تو اس کو ایک نئی دنیا پایا جس کی بنیاد اساسات جدیدہ پر ہے۔ شیخ اگرچہ نئے ملک کی تعمیر عالی سے متاثر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ان کی محبت اور عشق اسلام سے بڑھتا گیا اور اللہ تعالیٰ پر آپ کا ایمان اور اعتقاد بڑھا۔ آپ کی ماسکو کے کئی شیوعی زعماء سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے اصول کا مطالعہ کیا لیکن مسلم اور موحد باقی رہے۔ کیوں کہ انھوں نے اسلام کو روس کے انقلاب اور نظریات سے اعلیٰ پایا۔

یہ اسلام جس کو انھوں نے دیکھا تھا روسیوں کے انقلاب سے اعلیٰ تھا۔ یہ اسلام جس کو انھوں نے دیکھا تھا وہ اسلام نہ تھا جس کا نمونہ آپ نے غیر منقسم ہندوستان میں دیکھا تھا اور اس کے لیے اسلامی مملکت کا قیام ضروری تھا۔ وہ ہند کی مملکت ہو یا کسی غیر ملک کی۔

پھر حضرت شیخ ماسکو سے ترکی گئے اور یہ مصطفی کمال مرحوم کا زمانہ تھا اور وہ ترکی کی تعمیر جدید میں مشغول تھے۔ خلافتہ باطل ہوئی اور سوئزرلینڈ کا قانون رائج ہوا، اوقاف کو باطل کیا، دینی مدارس کو بند کیا، عربی رسم الخط کو تغیر کر دیا۔ شیخ نے وہاں چند سال قیام فرمایا اور بصیرۃ کی آنکھوں سے وہاں کے انقلاب کو دیکھا۔ معلوم نہیں کہ آپ کے قلب پر کیا تاثیر ہوا۔ لیکن آپ ان لوگوں میں نہ تھے کہ جب کوئی مکروہ چیز کو دیکھتے تو اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے کہ جب کسی چیز کو نہ دیکھیں تو اس کو معدوم زعم کریں بلکہ ان حوادث اور ان کے اسباب کو بصیرت کی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد شیخ نے جب دو انقلابوں کو دیکھا ایک روس کا اور دوسرا ترکی کا تو اسلام کے مرکز مکہ معظمہ کو قیمتی تجارب کے ساتھ دیکھا اور وہاں آپ کا شغل درس تدریس تھا۔ شیخ مسجد الحرام میں درس دیتے تھے اور خارج مسجد میں بھی درس دیتے تھے۔ وہاں بڑے بڑے علماء نے آپ سے کتب حدیث کو پڑھا اور آپ نے وہاں قرآن حکیم کا درس دیا اور فلسفہ امام ولی اللہ دہلوی کو پڑھایا۔ جیسے علامہ موسیٰ جار اللہ نے تفسیر کو پڑھا اور امالی تفسیر کو مرتب کیا (جس کے آٹھ پارے شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد سندھ میں چھپ چکے ہیں) علامہ موسیٰ جار اللہ لینن گراڈ کے تاتاری مسلمان تھے، جنھوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر دنیا کا سفر اختیار کیا۔ دس سال پہلے مجھے روس جانا ہوا اور لینن گراڈ بھی گیا جو روس کا اصلی مرکز تھا اور علامہ موسیٰ جار اللہ کی مسجد اور مدرسہ کو بھی دیکھا۔ وہاں ایک معمر شخص نے حالات سنائے۔ جب علامہ عبید اللہ سندھی رمضان شریف کے لیے حکومت سے رخصت لے کر علامہ موسیٰ جار اللہ کے پاس آئے تھے۔ علامہ موسیٰ مالدار آدمی تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی بیوی علامہ سندھی کے افطار اور روزہ رکھنے کے لیے روٹی خود پکاتی تھی۔ پھر اس نے کہا کہ وہ اگرچہ ایک عورت تھی لیکن علم میں ان بزرگ عالموں سے کم نہ تھی۔ میں نے جب یہ سنا تو ترجمان سے کہا کہ اس شخص سے کہو کہ وہ اپنا چشمہ اتار لے۔ میں اس شخص کی آنکھوں پر بوسہ لوں گا جس نے ایسے اشخاص کو یہاں دیکھا ہے۔ اس نے ایسا کیا اور میں نے اسے بوسہ دیا۔ وہاں میں نے علامہ کے کتب خانہ میں قاضی مبارک مکمل دیکھا جو تصورات اور تصدیقات پر مشتمل تھا۔ میرے ساتھ جناب محمود ہارون اور جناب کرم شاہ ازہری بھی تھے۔ وہاں کے مسلمان تاتاری تھے جو پکے مسلمان تھے۔ عورتیں بھی نماز کے لیے آئی تھیں۔ چوں کہ میں اور پیر کرم شاہ صاحب دونوں ڈاڑھی رکھتے تھے اس لیے وہاں کے لوگوں کی نظر میں ہم دونوں فقیر تھے۔ اس لیے

ایک بوڑھی عورت نے پیر کرم شاہ صاحب کو خیرات کے طور پر ایک روپیہ روسی دیا جس پر مجھے ہنسی آئی لیکن شاہ صاحب نے ایک روپیہ کو جیب میں رکھا۔ مکہ معظمہ میں جن دوسرے بزرگوں نے شیخ سے پڑھا ان میں شیخ عبدالرزاق آل حمزہ، شیخ محمد نور مرشد مکی، شیخ عبدالوہاب دہلوی، شیخ السید علوی مالکی ہیں۔ شیخ علوی مالکی نے مجھے مکہ مکرمہ میں بتایا کہ میں نے شیخ عبیداللہ سندھی سے مؤطا امام مالک کو پڑھا اور وہ ایسا بحر تھے کہ جس کا کوئی ساحل نہ تھا۔ سید علوی جیسا حافظہ میں نے دنیا کے اندر کوئی نہیں دیکھا اور شیخ ابوالطاہر امیر السمع، والشیخ سلیمان الیفح مدیر مکتبہ حرم والشیخ محمد السندی المکی والشیخ محمد النوبحری والشیخ عبداللہ الحجازی والشیخ عبداللہ لغاری سندھی اور پروفیسر محمد سرور اور شیخ عبداللہ کلنتوی وغیرہم نے آپ سے استفادہ کیا۔

شیخ جب حجاز میں اقامت پذیر تھے گوشہ نشینی میں ماضی کی زندگی میں فکر کرتے تھے تو اس زمانے میں اپنے دینی افکار کو ترتیب دیا۔ ان افکار کی صداقت میں آپ کو یقین اور اذعان راسخ و غیر متزلزل تھا اور آپ کا یہ ارادہ تھا کہ آپ کے افکار سے آپ کے اہل وطن مستفید ہوں تو آپ نے حکومت برطانیہ مستعمرہ کے قیود اور ضوابط کو برداشت کیا تاکہ اپنے وطن لوٹنے کی اجازت مل جائے اور ۲۴ سال کے تجربہ کے بعد جو افکار مرتب کیے تھے اپنے اہل وطن کو ان سے واقف کریں۔ یہ تھا آخر حیات میں اپنے وطن کی طرف لوٹنے کا سبب۔ جب کراچی سندھ میں ۷۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو لوٹے تو اپنے افکار کی اشاعت میں جلدی فرمائی اور قوم کو یہ خطاب فرمایا: "یہ اونچی عمارتیں جس کو تم آسمانوں سے بھی بلند سمجھتے ہو زمانہ کے ہاتھوں سے نجات نہ پائیں گی اور تمھارا تمدن اور تمھاری عشرت اور تمھارے افکار اور تمھارے آراء سب کمزور ہوگئے ہیں"۔ (حضرت شیخ کی کتاب التمہید کے مقدمہ (عربی) کا ترجمہ)

شذرات

(۲)

حضرت مولانا قاسمی صاحب مدظلہ نے الولی کے مختلف شماروں میں حضرت امام سندھیؒ کے بارے میں نہایت فکر انگیزاور معلومات افزا شذرات تحریر فرمائے ہیں۔یہاں چند اہم شذرات کو مرتب کر دیا گیا ہے (ا۔س۔ش)۔

(۱)

افادات حضرت مولانا عبید اللہؒ

سورۃ الکہف: عبقات چوتھے اشارہ میں انسانی مراتب کمال پر بحث کی گئی ہے۔سب سے پہلا مرتبہ اخلاق کی درستی ہے اسے تہذیب النسمہ سے تعبیر کرتے ہیں۔دوسرا مرتبہ نسمہ کا نفس ناطقہ میں فنا ہو جانا ہے یہ مرتبہ ولایتِ صغریٰ کہلاتا ہے،تیسرا مرتبہ کہ نفس ناطقہ کی تکمیل ہو جائے یعنی وہ نفس کلیہ میں فنا ہو جائے اور یہ ولایتِ کبریٰ ہے۔چوتھا مرتبہ ہے روح ملکوتی جو کہ نفس ناطقہ کا جزو ہے اسے حظیرۃ القدس میں فنا حاصل ہے اوراس کے ذریعہ سے تجلی اعظم میں فنا حاصل ہو اسے فائز بکمالات نبوت کہتے ہیں۔اس درجہ کے انسانوں میں سے کسی کو نبوت کا منصب عطا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کوئی کام نوع انسانی میں کرنا چاہتا ہے تو اس کام کے لیے نبی کو واسطہ بناتا ہے جیسے انسان اپنے ہاتھ پاؤں کو واسطہ بنالیتا ہے اسی طرح تجلی اعظم نبی کو ایک خاص فیض شائع کرنے کے لیے ذریعہ بناتی ہے،یہ درجہء نبوت ہے اور ان لوگوں کو ملتا ہے جو پانچویں درجہ تک ترقی کر چکے ہوں۔

شاہ صاحب ان پانچویں درجہ کے بزرگوں کو اصحاب قرب الفرائض کہتے ہیں اور چوتھے

درجے کے لوگوں کو اصحابِ قرب الوجود اور تیسرے درجہ کو اصحابِ قرب النوافل کہتے ہیں۔ اصحابِ قرب فرائض میں سے جو لوگ اس درجہ پر پہنچتے ہیں ان کی مثالوں میں ایک نام ذوالقرنین آتا ہے اور مریم یہ دونوں اصحاب پانچویں درجہ کی مثال ہیں۔ چوتھے درجے کے لوگوں میں جن کی مثالیں ملتی ہیں ان میں خضر کا نام آتا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

ینبطش یارب ویخرق مساکین ویقتل الغلام وماخرق وماقتل الرب تبارک وتعالیٰ وھویفعل مایرید، یہ اصحاب ولایتِ کبریٰ کی مثال ہے۔ یعنی قرب النوافل والوں کی الکھف، قدرت الٰہی ایک کام کرتی ہے۔ مثلاً مختلف قسم کی نباتات سے زمین زینت والی ہو جاتی ہے پھر سوکھا چٹیل میدان بن جاتا ہے۔ عقل مند انسان بھی یہی کرتا ہے کہ یہ کام بے قاعدہ تھا، اسی طرح اگر انسانیت میں کوئی چیز قدرتی طور پر پیدا ہو جائے جیسے چٹیل میدان میں سبزی تو جو شخص اسے سمجھنے کی کوشش نہ کرے گا اور ان کے لیے قاعدہ معلوم نہ کرے تو اسے ہرگز عقل مند نہیں کہا جاسکتا۔ کتب الٰہیہ جو نازل ہوتی ہیں ان سے پہلے ایک خاص جبلت کا انسان پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اس پر تعجب کرتا ہے اور انکار کے درجے تک پہنچتا ہے تو وہ احمقوں کا کام کرتا ہے، عقل منداس کی حکمت کے پیچھے پڑتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ ان کو سب چیزیں باقاعدہ نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی سوچنے والے انسان ہیں جو انسانیت کو ترقی دیتے ہیں اور تعجب کرکے انکار کرنے والے لوگ تو انسانیت کا برا پہلو ہیں۔ ایک پھل دار درخت ہے، اگر اس نے پھل دینا چھوڑ دیا تو اس کی لکڑی کاٹ کر جلا دی جائے گی، انسانیت اس سوچنے سمجھنے کے لیے ہی زمین پر پیدا کی گئی ہے کہ جو کام اللہ آسمان پر ملاء اعلا میں کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کو زمین میں سمجھنے والے آدمی پیدا ہوں، اس کو چلانے والے آدمی پیدا ہوں۔ جیسے فرشتے آسمان میں خدائی بات کو سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جو اسے کام میں لائے، اسی طرح زمین پر اعلیٰ سمجھ والے انسان پیدا ہوں، اور اعلیٰ کلام کو پورا کرنے والے آدمی پیدا ہوں۔ یہ لوگ یہ خیال کریں کہ یہ کام پورا کرنا ہماری طبیعت کا تقاضا ہے، اسے ہم خود پورا کرتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے آسمان پر کے فیصلہ کا زمین پر آئینہ بن جائیں گے، جو انسانیت کا درخت یہ ثمرہ نہیں دیتا لکڑی کی طرح کاٹ کر جلا دیا جائے گا۔ آدمی

کتب الٰہیہ کو اس طرح سوچنے لگے تو کتب الٰہیہ سے کہیں تناقض پیدا نہیں ہوگا، جو لوگ نبوت پر تعجب کرتے ہیں وہ اپنی من مانی کرتے ہیں کہ قدرت الٰہیٰ ایک طرح کام کر رہی ہے اور نبی جو تعلیم دیتا ہے اس کے مقابل ٹھیک نہیں ۔ اس شبہ سے انبیا کی تکذیب کرتے ہیں ۔ اب اگر اس شبہ کا حل کرنے والے آدمی پیدا ہو جائیں اور ثابت کر دیں کہ قدرت نے ایسے آدمی پیدا کیے ہیں، جس کا طبعی تقاضا ہے اور قدرت کا قدرت کے دوسرے کام سے تناقض نہیں ہوتا اس لیے کہ سارے جہان کا خدا ایک ہے، اگر قدرت کے منابع مختلف مان لیے جائیں تو اس حالت میں قدرتی امور میں تناقض ماننا جائز ہے مگر جب تک انسانیت سمجھتی ہے کہ سارے جہان کا نظام ایک خدا کے ہاتھ میں ہے اس وقت تک قدرتی امور کا تناقض ناممکن ہے، ایسے لوگوں کو اگر چھوڑ دیا جائے اور کوئی بتانے والا نہ ہو تو وہ وہی کام کریں گے جو کتاب الٰہیٰ نے انھیں بتایا گویا نبوت کی تعلیم ان کی طبیعت میں سے نکلتی ہے یعنی کتاب الٰہیہ ان کی جبلت کی تفصیل ہیں مثلاً حدیث جبلت کی تفصیل ہے اور اسی پر ہمارے مذہب کا مدار ہے ۔ اس سے ہم نے قوانین وضع کر لیے ہیں اسی طرح ان کی جبلت کی تشریح ملاءِ اعلیٰ میں ہو چکی ہے جو قرآن کی شکل میں نازل ہوئی ہے ۔ خدا تعالیٰ جو فیض دنیا کو دینا چاہتا ہے، وہ اس آدمی کے ذریعہ سے ہوگا ۔ اب وہ فیض الٰہیٰ اس آدمی کی جبلت کا رنگ اختیار کرے گا ۔ ملاءِ اعلیٰ کے لوگ اس فیض الٰہیٰ کو اس شخص کی جبلت سمجھ کر پیش کریں گے ۔ اور یہی کتاب الٰہیٰ بن جائے گی ۔ قرآن کو رسول اللہ کا دماغ پیدا نہیں کرتا بلکہ ملاءِ اعلیٰ کا دماغ پیدا کرتا ہے، مگر ملاءِ اعلیٰ کا دماغ رسول اللہ کے دماغ ہی سے بیج لیتا ہے ۔ غیر مسلم یہ کہتا ہے کہ رسول نے قرآن بنا لیا، ہم اسے کہتے ہیں کہ قرآن ملاءِ اعلیٰ میں یوں بنا ۔ اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اللہؐ کی استعداد کے موافق ہے تو ہم اسے قبول کریں گے اور اگر یہ کہے کہ اسے نبی کے دماغ نے گڑھ لیا ہے تو اس سے ہم انکار کریں گے ۔

اس میں ایسی چیزیں آئی ہیں جو تمام نوع انسانی سے تعلق رکھتی ہیں ۔ ایک طریق سے تمام شخص اکبر سے تعلق رکھتے ہیں اس کا احاطہ کرنا اور اس میں صحیح فیصلہ دینا نبی کے دماغ کا کام نہیں ۔ مثلاً نبی کو یقین ہے کہ میرے مخالفین مغلوب ہو جائیں گے اور قرآن کی جو تعلیم مجھے دی جا رہی ہے وہ غالب رہے گی، مگر وہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ چودہ سال کے بعد جنگ بدر ہوگی

اور اس میں کفار کو شکست ہوگی۔

فائدہ : رسول اللہؐ نے شروع میں جب اپنی دعوت ظاہر کرنے کا ارادہ کیا، تو صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر قریش کو پکارا اور ان سے کہا کہ اگر میں تمھیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے لشکر آرہا ہے تو تم مان لوگے یا نہیں؟ سب نے کہا کہ ہم آپ کی بات یقیناً صحیح مانتے ہیں کیوں کہ آپ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تم کو سخت عذاب کی خبر دیتا ہوں جو آئے گا۔ اب اس کے بعد میرا ترجمہ یہ ہے کہ سخت عذاب سے مراد انقلاب ہے اور اس انقلاب سے مراد ہے، قرآن عظیم کا مکہ کو فتح کرنا۔ اس وقت حالت ایسی تھی کہ قرآن کا مکہ میں کوئی نام لے نہیں سکتا تھا۔ انقلاب یہ ہوگا کہ یہی تعلیم یہاں حاکم بن جائے گی۔ یہ انقلاب ہے جس کی آپؐ خبر دے رہے ہیں، ان لوگوں کو جنھوں نے قرآن کی مخالفت کے پختہ ارادے کر رکھے ہیں یہ عذاب شدید ہوگا۔ اس کے بیس برس کے بعد مکہ فتح ہوتا ہے اور مدینہ سے فوج اس پر چڑھ کر آتی ہے، وہ عین اسی پہاڑی کے پیچھے سے آتی ہے۔ نبی کے دماغ نے یہ تو بتایا کہ عذاب آئے گا، مگر یہ نہیں بتا سکا کہ پہاڑ کے پیچھے سے آئے گا......... اس کے بعد رسول اللہ نے اس مقام پر کھڑے ہو کر فتح مکہ کے دن مکہ والوں سے اسلام کی بیعت لی ہے۔ یہی مقام ہے جہاں طواف صفا و مروہ کا شروع کیا جاتا ہے اور اس موقعے پر جو دعا پڑھی جاتی ہے اس کے لفظ یہ ہیں: الحمد للہ الذی نصر عبدہ وصدق وعدہ وھزم الاحزاب کلھا۔ ایک بندہ تھا جو قرآن لے کر کھڑا ہوا، اسے فتح دی۔ صَدَقَ سے اشارہ ہے اس وعدہ کی طرف جو پہلی پہاڑی پر وعظ میں کیا گیا تھا۔ یہ صفا سے شروع کر کے طواف کرنا اسی واقعے کی یادگار ہے، اور یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تھا، یہ اس کی یادگار ہے۔ ذبح اور مروہ کا ذکر تورات میں بھی موجود ہے۔ صفا میں حضرت ابراہیمؑ نے ذبح نہیں کیا۔ عام قصے سب غلط ہیں، اس کا ذکر موطا امام مالک میں موجود ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى : یہ ایک بڑا کرہ، اس کے کئی لاکھ ٹکڑے کرتے ہیں، وہ ٹکڑے مختلف پیدا کر لیتے ہیں۔ پھر اگر سب کو ملانا چاہیں تو پھر سب مل کر کرہ کا کرہ بن جاتا ہے۔ خلقت غایت اولیٰ میں ان دونوں حکمتوں کو پورا کرتی ہے۔ یعنی یہ تسویہ ایسی طرز سے

کیا گیا ہے کہ مخلوق مختلف شکلیں بدلے گی، لیکن کسی حالت میں بھی بیکار نہ ہوگی، یہ ایک شکل کے لیے ایک سوراخ ہے۔ جس میں وہ کھپ جاتی ہے، قَدَّرَ فَهَدٰی ہر ایک چیز کو کمال تک پہنچانا مقصود ہے۔ حکمت کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے جو آخری منزل ہے وہ مقرر و معین کر دی جائے اور اس راہ ترقی کا سارا پروگرام اسے بتا دیا جائے۔ یہ تقدیر اور ہدایت ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسی کا منتہیٰ کمال مقدر نہ ہو اور اس کی ترقی کے لیے اس کی ہدایت کا سامان مکمل پیدا نہ کیا گیا ہو۔ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی سب چیزوں کو خدا تعالیٰ نے مستوی اور برابر پیدا کیا ہے اور ہر ایک کی ہدایت اس نے کر دی ہے، تو کیا یہ انسان کے لیے بھی نہ ہوگا اور یہ ہدایت انسان سے پہلے حیوان کے لیے ضروری ہے، ہر حیوان کی زندگی سبزی کھانے پر موقوف کی گئی ہے۔ پھر اس کے لیے جو مقدر ہے اس کا راستہ اسے بتا دیا اور چراگاہیں پیدا کر دیں۔ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی سردی میں چراگاہوں کی سبزی سوکھ جاتی ہے تو حیوان کے لیے سوکھی گھاس بھی کام دیتی ہے۔ سَنُقْرِئُكَ انسان کی جو خصوصیت ہے وہ اس کا دماغی کمال ہے۔ حیوان کے پیٹ کے لیے جو چیز مقدر ہے اس کا انتظام اَخْرَجَ الْمَرْعٰی کر دیا اور کہا کہ انسان کے دماغ کے لیے جو کام مقدر کیا گیا ہے اس کا مرعیٰ نہیں ہوگا چناں چہ اس کا مرعیٰ حظیرۃ القدس ہے جس میں علوم پیدا ہوتے ہیں اور جو علوم اس وقت انسان کے لیے ضروری ہیں وہ محفوظ کر دیے جاتے ہیں۔

غُثَآءً اَحْوٰی جیسے ابر کے ذریعہ سے بارش آتی ہے، اسی طرح ایک انسان کے ذریعہ سے علوم کی بارش ہوتی ہے۔ نبی وہ انسان ہے۔ انسان کو علم دینے کے لیے ہم تجھے ابر بنانا چاہتے ہیں۔

فَلَا تَنْسٰٓی اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ جیسے پہلے پہل سبز گھاس تر و تازہ ہو جاتی ہے، اسی طرح جب علم نبی کے دل میں آتا ہے تو وہ تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ علم نبی کے بعد دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو جاتا ہے وہ دوسری ذہنیتوں میں نئی نئی شکلیں اختیار کر لیتا ہے تو اس کی طراوت کا ایک حصہ جو نزول وحی کے وقت تر و تازہ ہوتا ہے طبعی طور پر کم ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ۔

يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى؛ قرآن کی جو ظاہری شکل ہے (الجہر) اور اس کے بعد قوموں کے دماغوں میں جاکر شکل اختیار کرے گا (الخفی) وہ سب خدا کے علم میں ہے۔ قرآن کی تعلیم پھیلے گی تو کیا ساری دنیا کے لوگ سوسمار کھانے لگ جائیں گے، جیسے عرب کھاتے رہتے ہیں۔ یا قرآن کی تعلیم کو ہر قوم اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق قبول کرے گی اور خود اپنا رنگ ڈالے گی یہ ہے اَلْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى۔

وَنُيَسِّرُكَ انسانی ترقی کے دو راستے ہیں۔

ا.... انسان کی ملکیت اور بہیمیت کو متناسب ترقی دی جائے۔ یہ آسان راستہ انبیاء کا طریقہ ہے۔ اس کی انتہا حجر بحت کی تکمیل پر ہے۔

۲.... فقط ملکیت کو اتنا اونچائی پر پہنچا دیا جائے، جتنا حاملین عرش میں ہے اور بہاں نسے کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ ہاں صرف اتنا خیال رکھا جائے کہ وہ مرنے نہ پائے اور یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔ ان لوگوں کے جن کی طبیعتیں اس ہی کے لیے مخلوق ہوں کہ ان کا دماغ بہت بلند ہے یہ بعض انسان ہیں لیکن وہ بے کار ہوتے ہیں اب وہ سوائے سوچنے اور پڑھنے پڑھانے کے اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ باقی تمام انسان اس دوسرے طریقے پر نہیں چل سکتے۔ اس لیے رسول اللہؐ سے فرمایا گیا کہ ہم تجھے ایسا طریق بتاتے ہیں جو فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہے اور اسی لیے آسان ہے۔

چوں کہ طریقے دو ہیں تو فطرتیں بھی دو ہیں۔ جو انسان پہلی فطرت کا ہے اسے قرآن پڑھنا چاہیے دوسری فطرت والے کو پڑھانے میں وقت ضائع نہ کرو۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى؛ ہر ایک کے پیچھے پھرنے کی ضرورت نہیں۔ دوسری جگہ یہ کہ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ تو جبراً نہیں ہو سکتا تھا۔ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى؛ جس میں خدا کا خوف ہے، وہ جلدی یاد کرے گا۔ جس کی فطرت میں حجر بحت سے تعلق ہے اسے کوئی خدا سے ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ خود ہی ڈرتا ہے، خدا کے نام سے کوئی کام بتایا جائے تو وہ اس کی مخالفت کرنے سے گھبراتا ہے۔ مثلاً ایک عاشق ہے جب کسی سے محبت ہے وہ اپنے محبوب کی ناراضگی سے ہر وقت ڈرتا رہتا ہے اور ایک شخص ہے اسے کسی حاکم سے تعلق ہے جس کی رضا پر اس کی

ترقی کا انحصار ہے تو وہ ہر وقت اس سے ڈرتا ہے۔ پس جس انسان کو اس کی فطرت نے خدا یاد کرا دیا ہے وہ خدا کی کسی مخلوق پر ظلم کرنے سے خود بخود ڈرے گا۔ ایسے شخص کو ظلم دور کرنے کے لیے قرآن بتا دیا جائے تو وہ اسے فوراً سیکھ لے گا۔ رسول اللہؐ سے پہلے قوموں نے انصاف کرنے کی کوشش کی لیکن اب بین الاقوامی انصاف کی ضرورت ہے۔ دنیا بین الاقوامی انصاف کے لیے سرگرداں ہے، ایسا ہر کوئی شخص اس انصاف کو سیکھ لے گا۔

یَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَی اس سے دور رہے گا۔ وہ شخص جو شقی ہے، سخت دل، بے رحم، انصاف کرنا چاہتا ہی نہیں، اپنی کامرانی ہی فقط اس کا نصب العین ہے، یہ فعل انسان کو جہنم میں لے جائے گا۔ اور وہاں نہ اسے موت نصیب ہوگی اور نہ اس کی زندگی ہی اچھی ہوگی۔ نار کبریٰ وہ ہے۔

مَنْ تَزَكّٰى نفس ناطقہ کو نسمہ اور بدن پر غالب رکھنا تزکیہ نفس ہے۔ یہ پہلا درجہ ہے جسے اصحابِ مقامات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى خدا کا نام لیا پھر نماز پڑھی۔ اسے خدا کا نام لینے میں مزہ آتا ہے۔ یہ بات حجر بحت کی بیداری کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

فَصَلّٰى صلوۃ کے لوگوں نے مختلف ترجمے کیے ہیں وہ مفید نہیں آتے، یہ ہمارا اپنا ترجمہ ہے۔ صلی ماخوذ ہے ملنے سے، یعنی حجر بحت کو تجلی کامل سے تقابل پیدا ہو جائے۔ یہ ہے صلوۃ۔ اسے وصال کہیے یا صلوۃ، ایک ہی بات ہے۔ یہ جو ہماری نماز ہے اصل میں حجر بحت کو تجلی الٰہی کے مقابل ہونے کا طریقہ ہے۔ شریعت کی تعلیم سے جو انسانی تکمیل ہوتی ہے، اس کا ذکر اس آیہ کریمہ میں آگیا ہے۔ یعنی نفس ناطقہ کا غلبہ اور حجر بحت کا تقابل بہ تجلی ذات۔ بحت قریب کی زندگی کو بہت اہمیت دینے لگتے ہیں۔ آج ہمیں جو پیش آرہا ہے یعنی کھانا پینا وغیرہ اسے ہم سب سے زیادہ ممتاز کر دیتے ہیں۔ اس نقص نے ہمیں اس تعلیم سے پیچھے ڈال دیا ہے۔

اَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی دنیا کی زندگی سے آگے بھی نظر ڈالی جائے تو جتنا آگے بڑھو زیادہ مفید اور پائیدار چیزیں ملیں گی۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی اچھی چیزیں ہیں، لیکن وہ زیادہ اچھی

ہنیں ہیں اور نہ زیادہ دیرپا۔ پس آگے نظر رکھو اور خیرا خیرا اور ابقیٰ کی طلب کرو۔ یہ ساری نبوی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ اِنَّکَ یہ تعلیم پہلے صحیفوں میں بھی دی گئی ہے، وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں سے ہے۔ پہلے صحیفوں کے مطالعہ نہ کرنے سے غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کا صحیفہ گم ہو چکا ہے۔ یہ سب غلط مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

ایک مسلمان عالم اور ایک عیسائی مباحثہ کرتے ہیں اور مسلمان غالب آجاتا ہے۔ سننے والے اس کے اصولوں کو کلیتہً صحیح تسلیم کرلیتے ہیں۔ حالاں کہ وہ کلیتہً صحیح ہنیں ہوتے۔ وہ صرف اس مناظرے کے لیے صحیح ہوتے ہیں۔ مسلمان ایسے موقعوں پر کہہ دیا کرتے ہیں کہ مسیح کی انجیل اصل میں گم ہو چکی ہے، جس انجیل کا ذکر قرآن مجید ہے وہ یہ انجیل ہنیں ہے وغیرہ۔

ہماری رائے یہ ہے کہ عہدِ قدیم کی پہلی پانچ کتابیں جو موسیٰ کی مانی جاتی ہیں ان میں سے کتاب پیدائش صحیفہ ابراہیمؑ ہے، جو حضرت یوسفؑ کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ (ملتہ آبائی) سورۃ یوسف چناں چہ اس کی تکمیل اس کتاب میں ہوئی ہے۔ اس کے بعد کتاب الخروج سے لے کر آگے تک صحفِ موسیٰ میں ان پانچوں کو پڑھ کر دیکھ لو۔

(الولی۔اپریل ۱۹۷۲ء)

(۲)

سیالکوٹ، پنجاب کی سرزمین ہمیشہ سے مردم خیز خطہ رہا ہے۔ ماضی قدیم میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا عبداللہ لبیب، مولانا ابوالحسن اور مولانا قل احمد جیسی افاضل روزگار ہستیاں سیالکوٹ ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ علمی دنیا کو معلوم ہے کہ برصغیر کے علما کی کتابیں مصر اور استنبول میں سب سے پہلے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی چھپی تھیں، جن پر ان ملکوں کے فضلا نے حواشی بھی چڑھائے اور ان کتابوں کی ممالکِ اسلامیہ میں بڑی قدر ہوئی۔

علمائے سیالکوٹ میں مولانا قل احمد جو کہ علامہ عبدالحکیم کے پڑپوتے لگتے ہیں، انھیں وادی سندھ سے بڑا علمی تعلق رہا ہے۔ لاڑکانہ سندھ کے قریب ایک گاؤں "آرہ بجا" کے نام سے اب بھی موجود ہے، اس گاؤں کے مخدوم محمد آرہ بجا سندھی نے براہ راست مولانا قل احمد

سیالکوٹی سے فیض حاصل کیا اور ان سے سید عاقل شاہ ہالائی نے اور عاقل شاہ سے مولانا عبدالحلیم کنڈوی نے فیض حاصل کیا۔ جس سے شمالی سندھ کی دو بڑی درس گاہیں ہمایوں سندھ اور شہداد کوٹ سندھ پیدا ہوئیں۔ پہلی درس گاہ کے مؤسس خلیفہ محمد یعقوب صاحب اور دوسری درس گاہ کے مؤسس مولانا نور محمد تھے، پھر پورے سندھ میں ان کا علمی فیضان عام ہو گیا۔ "تلویح" اور "خیالی" پڑھانے کے لیے اس حلقے کے علما اپنے دروازوں پر جھنڈا گاڑتے تھے اور یہ ان کتابوں میں ان کے تبحر کی علامت تھی۔ معقول اور فلسفے میں میری سند صرف دو واسطوں سے مولانا فضل حق خیرآبادی سے ملتی ہے، باقی تحصیل سیالکوٹی میں میرے اساتذہ بھی اوپر کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حسن اتفاق یہ ہے کہ علامہ عبدالحکیم کے علم حدیث کا سلسلہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی وساطت سے سندھ کے محدثین سے جا ملتا ہے، اس طرح یہ علمی تعلق بہت پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔

یہ تو تھیں پرانے دور کی باتیں، ہمارے دور میں بھی اسی سیالکوٹ سے دو نابغہ روزگار ہستیاں، استاذ محترم مولانا عبیداللہؒ اور ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم پیدا ہوئے جن کی شہرت بھی اکناف عالم میں پہنچ گئی۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے اپنے اسلام کا اعلان سندھ میں کیا تھا اور سندھ ہی میں سکونت اختیار کی، اس وجہ سے سندھی کہلانے لگے، ورنہ اصل میں ان کا منشا اور مولد بھی ضلع سیالکوٹ تھا۔ مولانا مرحوم کی ساری زندگی سراپا انقلاب تھی، اس لیے آپ نے امام انقلاب کے لقب سے شہرت پائی۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ بے شک وہ اس لائق ہیں کہ ان کی یاد تازہ رکھی جائے، کیوں کہ انھوں نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کو غلامی کے خلاف اپنے اشعار سے جگانے کی کوشش کی بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا چاہا اور فرمانے لگے:

شرق و غرب آزاد ما نخچیر غیر   خشت ما سرمایہ تعمیر غیر
زندگانی بر مراد دیگر ان   جاوداں مرگ است نے خواب گراں

ان کے اشعار کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی خودی اور استقلال کو محسوس کیا اور ہر جگہ آزادی کی تحریکیں شروع ہو گئیں۔ برصغیر میں مسلمان انتشار کا شکار تھے، ان کے سامنے کوئی واضح راستہ متعین نہ تھا، اقبال نے ان کو واضح راہ بتلائی، جس پر وہ چل پڑے اور اس کے نتیجے میں انھوں نے آزادی حاصل کی۔ ایک مفکر شاعر کا اتنا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ اپنی جادو بیانی سے قوم کو صحیح راہ کی نشان دہی کرے، آگے اس کے لیے قربانیاں دینا اور قید و بند، دار و رسن کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا، یہ دوسرے لوگوں کا کام ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کو گل و بلبل کی داستانوں سے ہٹا کر انسانیت کی فلاح اور مسلمانوں کو سائنسی دور کی برکات سے استفادہ کرنے پر ابھارنے پر موڑ دیا۔ یہ ان کا بہت بڑا کمال اور کارنامہ ہے۔ آپ کا سرمایہ داری اور عیش پرستی کے خلاف نعرۂ مستانہ بھی بالکل وقت کی پکار تھی، اس نے عوام کو شعور اور خودی کو جلا بخشی۔

کئی سال ہوئے ایک مرتبہ ہم نے سندھ مسلم کالج کراچی میں استاذ محترم مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی یاد میں ایک برسی منائی جس کی صدارت تو سندھ کے مشہور صحافی اور دانشور سید علی محمد شاہ نے کی اور مہمان خصوصی مولانا عبدالمجید سالک نے تقریر فرمائی۔ لکھے پڑھے اور دانشور لوگوں کا بڑا اجتماع تھا۔ سالک مرحوم نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مولانا غلام رسول مہر ماضی قدیم میں فریضہ حج ادا کرنے گئے تھے، مکہ مکرمہ میں ان کی ملاقات علامہ عبید اللہ صاحب سندھی سے ہوئی، علامہ سندھی مرحوم نے اپنے پروگرام کی ایک کاپی مہر صاحب کو دی۔ مولانا نے یہ پروگرام استنبول میں بنایا تھا اور استنبول میں ہی انگریزی اور اردو ٹائپ میں چھپا تھا، جس کی خاص بات یہ تھی کہ ہندوستان کو مختلف اقوام کا ملک بتایا گیا تھا اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ان کے خصوصی حقوق اور اگر چاہیں تو الگ ہو جانے کے حق کا ذکر تھا۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب جب واپس ہوئے تو ڈاکٹر صاحب سے اس کا ذکر کیا اور وہ کاپی ان کو دے دی، ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس پروگرام کو سراہا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کو الہ آباد میں یونیٹی کانفرنس کی صدارت کے لیے جانا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے وہاں جو خطبہ دیا، اس میں سیالکوٹ کے دوسرے عظیم انقلابی اور مفکر علامہ عبید اللہ سندھی کے پروگرام کی

بعض اہم باتوں کا بھی ذکر کیا، مولانا اس وقت چوں کہ حکومت کے بائی تصور کیے جاتے تھے، اس لیے ان کا نام نہ لیا۔ اس تقریر کو مبارک ساغر کے اخبار سوشلسٹ کے سوا کسی دوسرے جریدے نے نہیں چھاپا۔ سوشلسٹ اخبار کا پرانا فائل آج بھی اس کے لیے شاہد ہے۔

بہرحال سیالکوٹ کے یہ دونوں اکابر برصغیر کے بڑے زعما میں تھے، جن کی بدولت وطن آزاد ہوا اور مسلمانوں کی بہت بڑی حکومت وجود میں آگئی۔

(الولی۔اکتوبر ۱۹۷۷ء)

(۳)

ایک مرتبہ میرے شیخ علامہ عبیداللہ سندھی نے فرمایا: اب ہم مذہب اور اقتصادیات کے متعلق اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

۱.... ہم قرآن حکیم کی تشریح موجودہ تہذیب کے عام نظریات سے کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ وہ ہماری عام قومی ذہنیت کے قریب آجائے اور ہم اسے اپنا سکیں، یعنی قرآن کی تشریح ان ہی نظریات کے اندر ہونی چاہیے۔

۲.... اس تشریح کو صحیح طریقے سے مقرر کرنے کے لیے ہم نے ایک پروگرام واضع کر لیا ہے۔ شاہ صاحب کی حکمت سے ادھر وہ انسانیت کے عام نقطہ نگاہ سے بات کو مشخص بناتے ہیں، اس فلسفہ کے تثبت سے برصغیر میں اسلامی تاریخ اور تعلیم کا نچوڑ محفوظ کر لیا۔ اس فلسفے کی تشریح میں یورپین اصول استعمال کرتے ہیں، ہم اسلام سے منحرف نہیں ہوسکتے بلکہ ہم یورپ کے لیے ایک راستہ گھڑ دیں گے کہ یورپ کو ہمارے انٹرنیشنل ازم میں داخل ہونے کی مجبوری پیدا ہو جائے۔

یورپ کو مجبور کرنے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحب کے فلسفے کے توسط سے برصغیر کو اسلام میں ہضم کر لیا جائے اگر اس میں کامیاب ہوگئے تو یورپ ہماری اطاعت پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اسلامی قومیں جو یورپی گروپ میں شامل ہو رہی ہیں، وہ اپنا فلسفہ، ہونے کی وجہ سے اس میں داخل ہو رہی ہیں اور جب ہم اپنے فلسفے کو فروغ اور تقویت

دے لیں گے تو اس کے اثر سے اسلامی اقوام اور ان کے اثر سے یورپ بھی اس ہمارے انٹرنیشنل ازم میں داخل ہوگا۔

حضرت شیخ کا یہ پروگرام چوں کہ وطن کی آزادی سے پہلے کا تھا لہذا آپ نے جو کچھ سوچا تھا اس دور کے حالات کے مطابق سوچا تھا، اس لیے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا 'اس پروگرام کی تکمیل میں، ہم مسلمانان ہند کے علاوہ دو قوموں سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ایک ہندو اور دوسرا انگریز۔ کسی اور قوم سے کسی قسم کا استفادہ کرنے کو اس تحریک کی موت سمجھتے ہیں'۔

دوسری مسلمان قوموں میں ایک قسم کی نخوت پیدا ہو چکی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ ملنے کو تیار نہیں ہیں اور اگر ہم ان سے استفادہ کرنے کا خیال کریں تو ان کی یہ نخوت اور ترقی پذیر ہوتی ہے، اور جب ہم ان سے علیحدہ ہو جائیں گے تو انھیں اپنے آپ کو سنبھالنے کی فکر ہوتی ہے۔

مثلاً یورپین سائنس، ہم عربی کے ذریعے پڑھیں یا براہ راست زبانوں میں؟ ہم عربی تراجم کے ذریعے سے یہاں کے مسلمانوں کو پڑھنا حرام سمجھتے ہیں۔ وہ سیدھا یورپ سے سمجھیں۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ: اس آیت کی حضرت شیخ نے ایک سائنسی تشریح فرمائی ہے جو یہ ہے:

لوہا جب تک اپنی صورتِ نوعیہ کا مالک ہے زندہ ہے، جب اس کی صورتِ نوعیہ اس سے چھین گئی، لیکن ذرے وہی باقی رہیں تو اسے ہم اس کی موت کہتے ہیں۔ دوسری حالت پہلی حالت کی ضد پیدا کرنے سے طاری ہوئی ہے۔ اس لیے حیات اور موت دونوں کو خلق کہتے ہیں

نبات: نباتات میں ظاہر ہے اس میں نشو و نما ہے۔ بیج سے ایک چیز پیدا ہوتی ہے اور جب یہ صفتیں نباتات سے ختم ہو جائیں تو ہم اس کو اس کی موت سے تعبیر کریں گے اور چوں کہ درخت کی موت ایک مضاد حالت پیدا کرنے سے پیدا ہوتی ہے اس لیے اسے خلق کہا جاتا ہے

حیوان : اب حیوانات کو لو، اس کی حیوانیت گم ہو جائے تو یہ اس کی موت ہے ۔ حس و حرکت ارادی ختم ہو گئی تو یہ موت ہے ۔ اس حس و حرکت کو ختم کرنے کے لیے ایک سبب پیدا کرنا پڑتا ہے ۔ اسی لیے اسے بھی خلق الموت کہہ سکتے ہیں ۔

انسان : اب انسان کی موت و حیات کو لو ۔ انسان کا جثہّ اور اس کے اندر نسمہ ہے جس وقت نسمہ جثہّ سے الگ ہو جائے تو اسے موت سے تعبیر کرتے ہیں اور جدائی خاص اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ ان اسباب کی تخلیق موت کی تخلیق ہے ۔

انسانی روح کو نسمہ ملا، پھر جسم دیا گیا تاکہ یہ چند کمالات جو اس کے اندر مجمل تھے مفصل کرے اور اس تفصیل کے بعد اسی تفصیل کو اپنے اندر محفوظ رکھے ۔ اگر ہو جائے تو اس نے انسانی پیدائش کا مقصد پورا کر دیا ۔ کسی انسان کو جسم دیا گیا لیکن اس نے اپنے مجمل کمالات کو اپنے جسد کے ذریعے کامل نہیں کیا تو گویا اس نے انسانی پیدائش کا مقصد پورا نہیں کیا پہلے کو دوسرے کی نسبت "احسن عملا" کہا جائے گا ۔

جو لوگ ناقص رہ جاتے ہیں، قدرت الہٰی ان کے ناقص رہنے پر خاموش نہیں رہتی بلکہ اس کے نقصان کی تلافی کے اسباب پیدا کرتی رہتی ہے، دنیا میں تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں اور وہ غلطی پر متنبہ ہوتا ہے یا موت کے بعد مختلف طریقوں سے سزائیں ملتی ہیں، تب وہ اپنی غلطی محسوس کرتا ہے ۔ اس کی انتہا اس میں ہو گی کہ وہ اپنی غلطیاں سمجھ لے اور اس کی تلافی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے ۔ جس دن یہ کرے گا اسی روز جہنم سے نکال دیا جائے گا اور اس کا حشر خصوصی ہو گا ۔ یعنی عام حشر سے پیچھے رہ گیا تو اس کا خاص قاعدہ بنا دیا جائے گا ۔ اس سے وہ ترقی کر کے امام نوع انسانی تک پہنچ جائے گا ۔ شرائع الہیہ میں ان خصوصی ترقیات کی کوئی بحث نہیں آتی ہے اس لیے ظاہری علما جو پورے عارف نہیں ہے وہ معاد کے متعلق اپنی معلومات کے اندر رہ کر چند غلط نظریات بنا لیتے ہیں اور اس سے جھگڑے پیدا کرتے رہتے ہیں ۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی حکمت کے مطابق انسان کی ترقی دو راستوں میں سے ایک راستے سے ہونا لازم ہے :

(۱) حجر بحت کی تکمیل سے :وہ تجلی الہیٰ کے خادموں میں شامل ہو جائیں گے ۔ کامل انسان تو الگ الگ کامل ہو جاتے لیکن ناقص انسان کو ملا کر ایک کامل انسان بنایا جاتا ہے یہ موت کے بعد کی زندگی میں بنتا ہے ۔ موت تک ترقی کرنے کا سامان تمام انسانوں کے لیے موجود ہے ۔

(۲) دوسرا راستہ یہ ہے کہ جس کے حجر بحت کی ترقی کامل نہیں ہو گی تو وہ دوسرے نمبر پر امام نوع میں ہضم ہو جاتا ہے ،. جہاں سے وہ نکلا تھا ۔ امام نوع انسان خود حاملین عرش میں سے ہے تو اس کا تعلق تجلی اعظم کے ساتھ اس طرح پیدا ہو جاتا ہے جس طرح دوسرے لوگوں کا ۔

(الولی ۔ فروری ، مارچ ۱۹۸۷ء)

(۴)

ایک تاریخی دستاویز

اسلام کی بنیادیں

بنی الاسلام علی خمستہ (پنج ارکان) یہ نفس اسلام نہیں ہیں ۔ لیکن ہم ان کو اسلام کے تمہید ماننتے ہیں ۔ جیسے کہ سیاسی پارٹی میں شامل ہونے کے لیے چند شرطیں عائد کی جاتی ہیں ۔ جب تک وہ شرطیں یا قواعد جن کی مشق کرنی پڑتی ہے ان کی مشق نہ کر لے پارٹی میں شامل نہیں ہو سکتا یا فوجی کمپنی میں نہیں لیا جاتا ۔ اسی طرح اسلام کے لیے یہ چند شرطیں اور بنیادیں ضروری ہیں ۔ ان بنیادوں پر اسلام کی عمارت ٹھہرائی جائے گی ۔ اس درجے کی قیمت نہایت اہم ہے یہ وہی درجہ ہے جسے پرائمری ایجوکیشن کہتے ہیں ۔ اور یہ لازم یا جبری ہونی چاہیے ۔ اعلیٰ تعلیم جبری نہیں ہوتی وہ استعداد کے مطابق انسان خود اپنے لیے متعین کر لیتا ہے مگر ابتدائی تعلیم جبراً دی جاتی ہے ۔ اس کا فلسفہ ہے کہ یہ ابتدائی باتیں بنیادی بتائی جائیں ۔ یہ مستقل فن ہے ۔

ایک کنڈرگارٹن کا ماسٹر ہے وہ دوسری چیزیں نہیں جانتا ، وہ حساب جانتا ہے ، یہی چیزیں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے ۔ اسی طرح علما کا عظیم الشان طبقہ ہے ۔ جو ان چیزوں کو پھیلاتا

ہے وہ بڑے آدمی ہیں اور ہنایت ضروری بھی ۔ لیکن یہ سمجھنا کہ اسلام ان ہی پر منحصر ہے یا ختم ہوگیا ۔ یہ غلطی ہے اتنا اسلام عوام کا اسلام ہے ۔

ہمارا اسلام ہے کہ پہلے قومی اور پھر اس کے بعد بین الاقوامی حکومت قائم کرنا اور یہ دونوں چیزیں قرآن کے حکم کے مطابق ہوں ۔ یہ ہے ہمارا اسلام !

قوم کا مفہوم

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم کا ترجمہ کیا ہے ؟ چند ناواقف لوگوں نے اسلامی تعلیم کو قوم کا ہم معنیٰ بنالیا ہے ۔ ہم اسے غلط سمجھتے ہیں، مگر آج بحث ہنیں کرتا ۔ قوم کا ترجمہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ایک مخصوص خطہء ارضی کی آبادی جس کی آب و ہوا اور باقی ضروری اشیا قریب قریب ایک ہوں وہ انسان کے مجموعے کو خالص رنگ دے دیتی ہیں ۔ وہ خصوصی رنگ جہاں نمایاں ہوتا ہے زبان ہوتی ہے اس کی تہہ میں طریق تفکر (.................) ہوتی ہے یہ زبان کا بطن ہے ، جب کہا جاتا ہے کہ قوم زبان سے بنتی ہے تو اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ خاص سائیکالوجی سے تیار ہوتی ہے پھر اس میں معاشرت کی جو ضرورتیں ہیں ان میں خاص شان ہوتی ہے وہ آپس میں ایک خاص طریقے سے ملتے جلتے ہیں اور جدا ہوتے ہیں محبت و عداوت کا ایک طریقہ ہے ۔ ان کے قریب دوسرے خطے میں ان کا ان معاملات میں رنگ اور ہے ۔ اس کے ساتھ ان کی معاشی چیزوں میں بھی اشتراک ہوتا ہے یعنی طبیعت اور فکر کے مطابق مختلف رنگ اور کھانے پکانے کی ترکیبیں دے دیں ۔ یہ ہوتا ہے ، لیکن چیز یہ ہوتی ہے کہ وہ چیزیں سب کو عام ملتی ہیں مثلاً سمندر کے کنارے رہنے والے لوگوں کو مچھلی زیادہ ملتی ہے اور ریگستان میں رہنے والوں کو جانوروں کا شکار کرنا پڑتا ہے ۔

ملک کا معنی

خلاصہ یہ ہے کہ وہ خطہ زمین جو لوگوں کو ایک زبان ایک سائیکالوجی ایک خاص قسم کی معاشرت اور ایک خاص معاش دیتا ہے ۔ اسے ایک قوم کہتے ہیں اور اس کی مسکونہ زمین کو ایک ملک کہتے ہیں ۔ اس کی حکومت کو ایک اسٹیٹ کہیں گے ، یہ انسانیت کی ایک اکائی ہے ۔

مذہب کا مفہوم

اس کی اجتماعی قوت میں ایک عمومی انسانی فکر داخل ہے اسے ہم مذہب کہتے ہیں۔ انسانیت کی تحلیل کرنے سے چند عقائد معلوم ہوتے ہیں جو انسانیت کو عام طور پر اپنی اصلیت پر قائم رکھتے ہیں۔ اور چند اخلاق ہوتے ہیں جو انسانیت کی ضرورت کو پورا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ان اعتقادات اور اخلاق کے مجموعے کو ہم مذہب سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسانیت کے درجے

ہم چاہتے ہیں کہ ہر ایک قوم انسانیت کے بلند نصب العین پر پہنچ جائے۔ اس لیے ہر ایک قوم میں انسانوں کے تین درجے ہو جائیں گے۔ (۱) علی، (۲) متوسط اور (۳) دنی

دینی اور لادینی قوم

اگر اس قوم کی لیڈر شپ اول الذکر دو حلقوں کے ہاتھ میں ہے تو اس قوم کو مذہبی قوم کہتے ہیں اور اگر پہلا طبقہ چھوڑ کر دوسرے اور تیسرے کے ہاتھ میں لیڈر شپ آجاتی ہے تو اسے ہم لادینی قوم کہیں گے۔

قومی اسٹیٹ

ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ ہم جو زبان بولتے ہیں اس زبان کو بولنے والی قوم کی حکومت اس کے ہاتھ میں ہو اور اسے اسٹیٹ مانا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس زبان میں قرآن کی تعلیمات اس طرح شائع ہو جائیں کہ انسانیت کا جو درجہ قرآن کو ضروری قرار دیتا ہے یہ ہماری قوم میں پیدا ہو جائے۔

بین الاقوامی رشتہ داری

اس کے بعد ہم ان تمام قوموں سے بین الاقوامی رشتہ داری قائم کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے قرآن کی انسانیت کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعے کو ہم انسانیت عامہ میں اول درجے پر رکھنا چاہتے ہیں اور قرآن اور دوسرے ادیان نے جن قوموں

میں قوی انسانیت پیدا کی ہو ان کو قرآن کے پیدا کردہ بین الاقوامی مجموعے کے ساتھ دوسرے درجے پر رکھنا چاہتے ہیں اور اس سارے مجموعہ انسانیت میں جو افکار قدر مشترک ہوں گے ان پر ہم عام انسانیت کی تربیت کرنا ضروری سمجھتے اور اس عمومی فکر ہی پر ہماری جنگوں کا خاتمہ ہوگا۔

دیہات میں (۱) علم، (۲) صحت، (۳) خوراک، (۴) کپڑا پہنچاؤ، جب لوگ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائیں تو انھیں قرآن کی تعلیم دی جائے۔ قومیت کی تعمیر ان اسباب سے کی جائے، جن سے قومیں بنتی ہیں۔ مذہب اس کے ذیل میں جزئی حیثیت سے اپنے مقام پر رہے گا۔

قومیں دو قسم کی ہیں؛

(۱) دینی اور (۲) لادینی

دینی قوموں میں مسلمانوں کے علاوہ اور بھی ہیں۔

لادینی قوموں کا اجتماع یورپ میں اب زور سے ہو رہا ہے۔

ہماری خواہش یہ ہے کہ دینی قوموں کا اجتماع بھی ہو۔ یعنی مسلمان اور دوسری دینی قومیں مل جائیں، اگر ایسا ہو جائے تو لادینی پروگرام سب کا سب تباہ ہو جائے یا دوسرے درجہ پر آجائے۔ اس دینی اجتماع کے لیے بھی شاہ صاحب کے فلسفے کے سوا کوئی اور مقام اتصال نہیں ہے۔ اس لیے ہم لاہور کو مسلمان نوجوانوں کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ لاہور کی مرکزیت دہلی کی طاقت انتقال سے ہوئی ہے۔ انگریزی عہد میں مطلب کو سمجھنے کے لیے دہلی اور لاہور کو ایک سمجھنا چاہیے اس کے تین فائدے ہیں؛

(۱) ہمارا دین محفوظ ہو جائے گا۔

(۲) دوسرے دینی گروہوں کو ہم اپنے اندر لے آئیں گے۔ اور

(۳) لادینی گروہ کا موثر مقابلہ کر سکیں۔

(الولی - اپریل ۱۹۸۷ء)